حج اور قرآن

شہید آیت اللہ بہشتی نور اللہ مرقدہ
ترجمہ: مولانا سید احتشام عباس زیدی صاحب

آیات حج کا ترجمہ

حج و عمرہ کو خدا کی رضا اور اس کی خاطر بجالاؤ۔
لیکن اگر اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں تمہارے سامنے کوئی رکاوٹ آجائے تو اتنا ہی کافی ہے کہ اپنی جگہ پر تاحد امکان قربانی کا فریضہ انجام دو (اور احرام کھول دو تا کہ تمہارا حج اسی منزل پر تمام ہوجائے) اور (اگر تم حج کو جاری رکھے ہوئے ہو تو) اس وقت تک اپنے بال نہ تراشو جب تک تمہاری قربانی اپنی منزل تک نہ پہنچ جائے (اور قربانی سے پہلے اپنے سر کے بال نہ تراشو) لیکن اگر کوئی شخص بیمار ہے یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہے تو (اسے چھوٹ ہے کہ وہ سر نہ تراشے اور) اس کے بدلے میں روزہ، صدقہ یا قربانی کی صورت میں کفارہ ادا کردے (ان دنوں کا کفارہ جن میں تم امن وسکون سے رہ رہے ہو) لیکن اگر ممکن ہو تو حج کو مکمل کرو۔ جو شخص حج کو حجِ تمتع کی شکل میں بجالا رہا ہے یعنی عمرہ بجالا رہا ہے، ساتھ ہی چاہتا ہے کہ اسے حج سے بھی ملادے تو اگر اسے میسر ہو تو ایک قربانی حج کے لئے بھی رکھ چھوڑے اور اگر اس کے پاس قربانی کا جانور نہیں ہے (مل نہیں رہا ہے یا وہ خرید نہیں سکتا) تو وہ تین روز حج کے درمیان اور سات روز جب وہ اپنے گھر واپس ہو، کل ملا کر کامل دس روز روزے رکھے۔ یہ حکم (فطری طور سے) اس شخص کے لئے ہے جس کا گھر مسجد حرام کے قریب نہ ہو (اور وہ اس علاقہ کا رہنے والا یا اہل مکہ میں سے نہ ہو) خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ خدا کا عذاب شدید اور سخت ہے۔

حج، معین مہینوں سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا جو شخص حج کا ارادہ کرے وہ جان لے کہ جنسی استفادہ، جھوٹ، فسق وفجور، گناہ، مجادلہ (یا قسم کھانا) حج میں منع ہے اور ہر وہ نیک کام جو تم انجام دیتے ہو خدا اسے جانتا ہے۔ زادِ سفر مہیا کرو کہ بہترین زادِ سفر تقویٰ ہے اور اے صاحبانِ فہم وخرد میرا تقویٰ اختیار کرو۔

اگر تم حج کے سفر میں اپنے پروردگار کی بخشش اور عطا کی جستجو میں بھی رہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (مراسم حج میں) جب تم عرفات سے چل کر مشعر حرام کے نزدیک پہنچو تو خدا کو یاد کرو (اور ذکر خدا میں مشغول ہوجاؤ) خدا کو یاد کرتے رہو جس طرح خدا نے تمہاری ہدایت فرمائی جب کہ تم اس کے پہلے گمراہ تھے۔

(اس کے علاوہ تم) وہاں سے جس جگہ سے تمام افراد روانہ ہوتے ہیں (منیٰ کی طرف) چل پڑو اور خدا سے اپنے گناہوں کے سلسلہ میں مغفرت کی دعا کرو کیوں کہ

خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔
اور جب تم حج کے تمام اعمال انجام دے لو تو اپنے خدا کو اس طرح یاد کرو جیسے تم اپنے آباؤ اجداد کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بڑھ کر اپنے خدا کو یاد کرو۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اے میرے خدا ہمیں اسی دنیا میں تمام چیزیں یا نعمتیں عنایت فرمادے (یعنی ہم جزا کے طور پر اپنا حصہ اسی دنیا میں چاہتے ہیں) یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت میں اپنا کوئی حصہ نہیں رکھتے۔
لیکن ایک دوسرا گروہ بھی ہے جو یہ دعا کرتا ہے کہ: خدایا دنیا میں بھی ہمیں بہتر زندگی عطا فرما اور آخرت میں بھی اپنے الطاف سے محروم نہ رکھ اور ہمیں دوزخ (اور عذاب آتش) سے محفوظ رکھ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کچھ انھوں نے خود سے حاصل کیا ہے اس سے بھی بیش قیمت حصہ پائیں گے اور خدا بہت جلد حساب کرنے والا ہے۔ (ان مراسم کی انجام دہی کے بعد) بھی مخصوص دنوں میں خدا کی یاد میں مشغول رہو۔ اگر کوئی شخص جلدی کر بیٹھے اور دو ہی روز میں (منیٰ سے مکہ کی طرف پلٹ آئے) تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اگر کوئی تیسرے دن ٹھہرا رہے اور تاخیر سے آئے جب کہ تقویٰ و پرہیزگاری اس کے پیش نظر رہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں اور جان لو کہ تم سب اسی (خدا) کی جانب پلٹائے جاؤ گے۔

ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور ہاجرہؑ

یہ سورہ بقرہ ۱۹۶ سے ۲۰۳ آیتوں کا ترجمہ تھا جس میں کہیں کہیں مختصر توضیح بھی کی گئی ہے۔ جو حضرات حج سے مشرف ہو چکے ہیں یا مناسک حج سے واقفیت رکھتے ہیں وہ ان آیتوں سے ایک حد تک آشنا ہیں لیکن جو افراد اس سلسلہ میں معلومات نہیں رکھتے ہیں انھیں ان آیتوں کے سمجھنے میں کافی وضاحت کی ضرورت ہوگی۔ قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جناب ابراہیمؑ خدا کے حکم سے جناب اسماعیلؑ اور جناب ہاجرہؑ کو فلسطین میں واقع اپنے گھر سے لے کر نکلے۔ جناب ابراہیمؑ کا واقعہ جسے آپ بارہا سن چکے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے ''سارا'' نام کی خاتون سے شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہوسکی۔ اس زمانہ میں چونکہ اس معاشرہ میں اولاد اور خصوصاً اولاد نرینہ کی بڑی اہمیت تھی جیسا کہ آج بھی ہمارے موجودہ معاشرہ میں خاندانی روابط کے استحکام میں اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ جناب ''سارا'' نے غور کیا کہ میں تو بہرحال صاحب اولاد نہ ہوسکوں گی لہٰذا اپنی کنیز کو جن کا نام ''ہاجرہ'' تھا اپنے شوہر ابراہیمؑ سے بیاہ دوں تاکہ اس کے ذریعہ ابراہیمؑ کی ذریت پروان چڑھے۔ ''ہاجرہ'' سے جناب ابراہیمؑ کے یہاں ایک فرزند متولد ہوا جس کا نام اسماعیلؑ رکھا گیا۔ چنانچہ فطرتاً بچہ کی پیدائش کے بعد ''سارا'' اور ''ہاجرہ'' کے انداز میں فرق آ گیا۔ اب وہ پہلے جیسی بات نہ تھی، پہلے ہاجرہ ایک خادمہ کی حیثیت سے اس گھر میں رہتی تھیں اور اب زوجہ کی حیثیت سے اپنے شوہر کے گھر میں رہ رہی تھیں اور وہ بھی ایک فضیلت وامتیاز کے ساتھ یعنی صاحب اولاد بیوی اور بیٹے کی ماں ہونے کی حیثیت سے۔ لہٰذا ''سارا'' کو احساس ہوتا تھا کہ ہاجرہؑ اب پہلے جیسی نہیں رہیں۔ رفتہ رفتہ سارا کے لئے ہاجرہؑ کا وجود ناقابل برداشت ہوتا گیا۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی بیماری اور اذیت

ہے جسے کم ہی خواتین برداشت کر پاتی ہیں۔

جب ابراہیمؑ نے یہ دیکھا کہ ہاجرہؑ اور اسماعیلؑ کا یہاں رہنا ان کی گھریلو زندگی کے سکون و آرام کو درہم و برہم کر دے گا۔ تو آپ اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے لگے اور قرآن کریم کے مطابق، خداوند عالم نے انھیں یہ حکم دیا کہ اسماعیلؑ اور ہاجرہؑ کو ہمیشہ کے لئے سرزمین فلسطین سے دور کہیں اور پہنچا آئیں۔

یہاں توریت میں ایک ایسے علاقہ کا نام ذکر کیا گیا ہے، جس کی تعیین میں جغرافیائی اعتبار سے بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں اس وقت توریت سے سروکار نہیں ہے۔ قرآن کریم کی آیات سے جو بات معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ جناب ابراہیمؑ، اسماعیلؑ و ہاجرہؑ کو مکہ کی سرزمین پر لے کر آئے۔ اس وقت وہاں چند بدّو عرب خانوادے ایک مختصر سی آبادی کی صورت میں رہ رہے تھے۔ مکہ اس وقت نہ تو ایک شہر کی صورت میں آباد تھا اور نہ ایک اچھی خاصی آبادی کی کوئی شکل ہی تھی۔ کیوں کہ وہاں زندگی کے امکانات بہت ہی محدود تھے۔ آج بھی شہر مکہ، حجاز کے دوسرے شہروں کے مقابلے میں بے آب و گیاہ، اجاڑ اور خشک شہر ہے۔ اگر چہ گزشتہ چند برسوں میں اسکی حالت قدرے سدھر گئی ہے۔ اس کے باوجود اگر مدینہ سے اس کا موازنہ کیا جائے تو مکہ ایک بے آب و گیاہ خشک شہر نظر آئے گا۔ اگر چہ مسجد حرام سے سات سو میٹر کے فاصلہ پر موجودہ وسائل کے تحت کچھ شجرکاری اور ہریالی پیدا کی گئی ہے پھر بھی مکہ کو ایک خشک اور بے شجر شہر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کے بہ نسبت طائف یا مدینہ میں پانی، سبزے، باغات اور کھیتیاں ان علاقوں کی شادابی کا ثبوت دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس وقت مکہ میں جانوروں کو پالنے یا کھیتی کرنے کے امکانات بہت ہی کم تھے جس کے نتیجہ میں وہاں زندگی دشوار تھی۔

بنائے کعبہ

جناب ابراہیمؑ نے جناب ہاجرہؑ و اسماعیلؑ کو ایسی ہی ویران اور اجاڑ جگہ پر لا کر بسایا۔ اس کے بعد قرآن کریم میں اس سلسلہ میں مزید وضاحت نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو خداوند عالم کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ وہ دونوں مل کر اس کی عبادت کرنے والوں کے لئے ایک گھر تعمیر کریں۔

توریت بھی اگر چہ اس سلسلہ میں بہت زیادہ وضاحت نہیں دیتی لیکن اس کی شرحوں، تفسیروں اور بنی اسرائیل کی دوسری تاریخی کتابوں میں اس پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن چوں کہ ان کی تاریخی حیثیت روشن اور مسلم نہیں ہے، لہٰذا ان مصادر سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم یہاں بھی قرآن سے استفادہ کرتے ہیں جو سند کے اعتبار سے قطعی و یقینی حیثیت کا حامل ہے۔ بہرحال اسماعیلؑ اسی سرزمین مکہ میں زندگی گزارتے ہوئے منزل شباب کو پہنچے اور دونوں باپ بیٹے کو خدا کی عبادت کے لئے اللہ کی جانب سے ایک گھر بنانے کا حکم ملا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خدا کا یہ گھر تعمیر کے سادہ ترین آلات و وسائل کے ذریعہ بنایا جاتا ہے اور بلا کسی تڑک بھڑک اور شان و شوکت کے ناتراشیدہ پتھروں کو تلے اوپر رکھ کر

صرف قد آدم تک ایک چہار دیواری کھینچ دی جاتی ہے تا کہ اللہ کی عبادت کے لئے ایک جگہ معین ہو سکے۔ غور طلب نکتہ یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے:۔

جب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اس گھر کی دیواروں کو بلند کر رہے تھے تو ان کے لبوں پر یہ دعا تھی کہ خدایا اس جگہ، اس گھر اور اس سرزمین کو ہمارے فرزندوں کی اقامت گاہ قرار دے اور زندگی بسر کرنے کے امکانات ان کے لئے فراواں کر دے اور ہمارے فرزندوں کو اس کی توفیق عطا فرما کہ وہ خدا پرست، طیب و طاہر، حق کے بندے اور حق کی راہ میں زندگی گزارنے والے ہوں اور ہمیں بھی یہ حکم صادر فرما کہ ہم تیری عبادت و پرستش کے قانون کے تحت کون سا عمل بجالائیں؟ اعمال و عبادات اور اس کے طریقوں کے سلسلہ میں ہماری رہنمائی فرما۔　　(بقرہ: آیات ۱۲۷۔۱۲۸)

اس غیر مرئی خدا کی عبادت و پرستش، پاکیزگی وصفائے قلب اور اس کی عظمت کی مناسبت سے ہونی چاہئے۔ وہ خدا جسے ہم نہیں دیکھتے اور جس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ ہم یہ جانتے ہیں کہ وہ سب سے بزرگ و برتر ہے یہاں تک کہ ہمارے قیاس وخیال اور وہم وگمان سے بھی بالاتر ہے ایسے خدا کی عبادت اور اس عبادت کا طور وطریقہ۔ بت پرستی، اشخاص پرستی، بودھوں کے طرز پرستش، آفتاب و ماہتاب وستاروں کی پرستش یا درخت و چوب وسنگ کی پرستش سے بہرحال فرق رکھتا ہے۔ اگر چہ بت پرستوں نے بھی بتوں کی پرستش وعبادت کے لئے مخصوص رسمیں، ترانے، آہنگ اور بتوں کی تعظیم وتکریم کے لئے مخصوص تکلفات وضع کر رکھے ہیں۔ نیز ان کے آئین میں کسی شخص کو بھی اس کی اجازت نہیں ہے کہ جس کا جس طرح جی چاہے بتوں کی پرستش کرے۔ لیکن خدا کی عبادت کا مسئلہ اس سے کہیں بالاتر اور اہم ہے اور وہ یہ کہ ہم کیا کریں کہ خدا کے لئے ہماری عبادت بت پرستی کی شکل اختیار نہ کرنے پائے؟ یہ بات بہت اہم ہے یہاں واقعاً ہر کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ جس طرح چاہے خدا کی عبادت کرے۔

خدا کی عبادت اس کی معرفت کی روح سے ہم آہنگ ہونی چاہئے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ میں فلاں عمل خدا کی رضا کے لئے یا اس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے صرف خدا پرستی کے عنوان سے انجام دے رہا ہوں۔ لہٰذا اب مجھ پر کوئی تنقید نہیں کر سکتا، تو ہم اس سے یہ کہیں گے کہ خدا کی عبادت کا طور وطریقہ خود الٰہی تعلیمات سے حاصل کرنا چاہئے۔ خود ساختہ خدا پرستی کجروی اور گمراہی کا سبب بنتی ہے، کیوں کہ اس طرح خدا کا تقرب حاصل کرنا غلط ہے اور اسلام کے خداشناسی اور عبادت کے تصور سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتا۔ بہر حال جناب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے خدا کی بارگاہ میں یہ درخواست کی کہ اے خدا تو اپنی عبادت کے طرز وآئین کو ہمارے لئے خود بیان فرما دے۔　　(سورۂ بقرہ/آیت ۱۲۸)

اس طرح ایک گھر کی تعمیر کی جاتی ہے جو رفتہ رفتہ خدائے وحدہ لاشریک کی عبادت و بندگی کرنے والوں کے لئے اجتماع کا مرکز بن جاتا ہے اور دھیرے دھیرے وحی الٰہی کے فرمان کے مطابق جناب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اس گھر میں خود اپنے لئے اور تمام بنی نوع انسان کے لئے خدا کی عبادت کے طریقے

معین ومقرر فرماتے جاتے ہیں کہ لوگو! اس طرح حج کے اعمال بجالاؤ اور خدا کی عبادت کے مراتب ومدارج کو محفوظ رکھو۔

حج کے نام پر خرافات وتوہمات

چونکہ کوئی شئے بھی زمانہ کے دستبرد سے محفوظ نہیں رہی، لہٰذا یہ احکام وقوانین عبادت بھی دہر کے ہاتھوں سے نہ بچ سکے۔ ابھی کچھ دن نہ گزرے تھے کہ جناب ابراہیمؑ واسماعیلؑ کے ذریعہ مقرر کردہ خدا پرستی کے مناسک وقوانین میں چند توہمات وخرافات کا اضافہ بھی ہوگیا اور کچھ مزید ایام گزرنے کے بعد وہ سادہ اور غیر مزیّن گھر جو ہر عیب ونقص سے پاک خدا کی عبادت کے لئے تعمیر کیا گیا تھا ایک بڑے بت خانہ میں تبدیل ہوگیا اور حج کے وہ اعمال ومناسک جو خدا کی عبادت کے عنوان سے انجام دیئے جاتے تھے، حج کے نام پر فقط توہمات وخرافات کا پلندہ بن گئے۔ اب یہ حج خانۂ خدا کا حج نہیں تھا بلکہ ایک بڑے بت خانہ کا حج تھا۔

حج کے اعمال ومناسک میں یہ فرض تھا کہ جو شخص بھی عبادت گزاروں کے اس اجتماع میں چند روز کے لئے شرکت کرنے مکہ معظّمہ آئے وہ شان وشوکت کے اظہار کے لئے لباس فاخرہ پہن کر نہ آئے اور اس جگہ اس کا لباس اور اس کے شب وروز دوسروں کے لئے اپنے مال ودولت جاہ وجلال، بزرگی وعظمت کی نمائش نہ بنیں، بلکہ وہ سادگی کو اپنا شعار بنائے لیکن مرور ایام سے یہ مفہوم اس قدر تبدیل ہوا کہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا، اظہار تجمل وشان وشوکت سے روکے جانے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ لباس ہی نہ پہنیں بلکہ ایک دم مادرزاد برہنہ ہوکر یہاں آئیں اور اسی حالت میں خانۂ کعبہ کا طواف کریں۔ چنانچہ تھوڑے وقفہ کے لئے تجمل اور شان وشوکت سے روکے جانے کا مطلب یہ نکال لیا گیا کہ برہنہ طواف کرنا چاہئے اور تماشا یہ کہ اس کی توجیہ بھی باآسانی یہ کی جاسکتی ہے کہ چوں کہ یہ ایسا باعظمت مقام ہے جہاں ہر شخص کو اپنے آپ سے بے پرواہ وغافل ہوکر فقط خدا کو یاد کرنا چاہئے اور جب انسان اپنے آپ سے غافل ہوجائے تو وہ اپنے اردگرد سے بھی غافل ہوجاتا ہے کہ اس کے ساتھ یا آگے چلنے والا انسان ہے یا جانور، لباس پہنے ہے یا برہنہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس غلط نظریہ کی توجیہ کتنی آسانی سے کردی گئی اور وہ بھی کس قدر عالی اور پُر معرفت توجیہ۔

اتفاق سے دین کی صحیح شناخت کے سلسلہ میں جو مسائل درپیش ہوتے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر ہم اس طرح کی توجیہات کے ذریعہ دین کی حقیقت کو پہچاننا چاہیں تو آسانی سے اسے صحیح یا غلط ہر رنگ میں ڈھال سکتے ہیں۔ میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ دو متضاد مطالب کے سلسلہ میں ایک سطح کا ذہن رکھنے والے افراد کے دو الگ الگ مجمع میں ایسی دلچسپ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ دونوں گروہ بے ساختہ کہہ اٹھیں۔ کیا اچھی اور صحیح بات کہی گئی ہے۔ لیکن جب ان دونوں گروہوں کے افراد آپس میں ملتے ہیں تو انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جس بات کو انھوں نے ایک خاص آئیڈیالوجی اور ایک طرز فکر کے تحت صحیح تسلیم کیا تھا وہ اس کی ایک دم ضد اور الٹی بات ہے جسے ان کے دوسرے رفیقوں نے ایک الگ فکری بنیاد کے تحت صحیح مانا ہے۔ کیوں کہ دراصل یہ توجیہیں غلط اور

گمراہ کن فکری استدلال کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اسی لئے اسلام میں اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ نہ صرف دین کے معاملے میں بلکہ مجموعی طور پر اصول زندگی کے انتخاب کے سلسلہ میں مسلمات اور مستحکم افکار ونظریات پر بھروسہ کرنا چاہئے اور حتی الامکان ذوق وسلیقہ اور ظن وگمان سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اگر صرف ظنی وذوقی توجیہات سے کام لیا جائے تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ دو متضاد باتوں کو ایک ہی گروہ کے درمیان صرف چند ماہ کے فاصلہ سے ایسی دلچسپ توجیہ کے ساتھ بیان کروں کہ گذشتہ تقریر پر واہ واہ کرنے والے افراد اس تقریر پر بھی واہ واہ کہہ اٹھیں اور اس سے غافل ہوجائیں کہ ابھی چند ماہ پہلے میں اس کی ایک دم الٹی تصویر پیش کر چکا ہوں۔

ہمارے زمانے کے جوشیلے اجتماعات کا حال بھی یہی ہے کہ لوگ جذبات واحساسات سے متاثر عوام کو جذباتی اور ہیجان انگیز تقریروں کے ذریعہ اِدھر اُدھر گھماتے پھراتے ہیں اور وہ بیچارے تھوڑے ہی وقفہ کے فاصلہ سے ایک دوسرے کی ایک دم متضاد باتوں پر کبھی زندہ باد اور کبھی مردہ باد کا شور بلند کرتے رہتے ہیں۔ یہی ناپختہ فکری کی نشانی ہے۔ لہٰذا ان کی محکم اور استوار زندگی کے لئے انسانی معاشرہ کی سب سے اہم خدمت یہ ہے کہ اسے صحیح انداز فکر کا سلیقہ سکھایا جائے اور نہ صرف یہ سلیقہ انھیں سکھایا جائے بلکہ اسی نہج پر ان کی تربیت بھی کی جائے تا کہ وہ ہمیشہ صحیح ڈھنگ سے سوچنے اور فکر کرنے کے عادی ہوجائیں۔

یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ خداوند عالم نے ان مذکورہ آیات کے ذیل میں ''یااولی الالباب'' یعنی ''اے صاحبان خرد'' کی قید کے ساتھ انسان کو مخاطب کیا ہے، وہ اس لئے کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ انسان ہمیشہ صحیح واستوار فکر کو بروئے کار لائے۔ کیوں کہ یہی تمام مسائل کے حل کی کلید ہے۔ یہ بات غور کرنے کی ہے کہ اگر پیغمبرؐ خدا وعلیؑ مرتضیٰ دس ہزار سال تک اس دنیا میں تشریف رکھتے اور اتنی مدت تک تبلیغ کے دوران ان کا سابقہ بے وقوفوں اور ناسمجھ افراد سے پڑتا تو کیا وہ حضرات ہدایت کا کوئی کام انجام دے سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ لہٰذا پیغمبر اکرمؐ کی مکہ کی تیرہ سالہ تبلیغی زندگی میں سب سے پہلی کوشش یہی تھی کہ دین کے لئے پورے طور سے آمادہ افراد کو پہلے فکری طور سے کامل ومستحکم بنایا جائے تا کہ یہ لوگ اس تحریک کے لئے ڈھانچے کا کام دے سکیں اس طرح یہ تحریک آنے والے دنوں میں بھی عمومی طور سے بالغ نظری اور فکری رشد وکمال کی فضا قائم کر سکے۔

مناسک حج میں تحریف

بہرحال لوگوں نے جناب ابراہیمؑ کے بعد حج کے مراسم میں بڑی تحریفیں کر ڈالیں۔ مقصد یہ تھا کہ جو شخص بھی حج کے ارادے سے خدا کے گھر کی طرف جائے اسے چاہئے کہ ان چند دنوں کے لئے اپنی بزرگی و برتری کو فراموش کردے تا کہ سب کے سب وہاں یکساں ہوجائیں۔ لیکن ا س کی مضحکہ خیز توجیہ یہ کی گئی کہ اس سے بہتر یکسانیت کی اور کون سی صورت ہوگی کہ سب برہنہ ہوجائیں۔ چنانچہ اس میں مردوں اور عورتوں میں کوئی امتیاز نہیں رکھا گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ عورتیں رات کی تاریکی میں برہنہ ہوکر طواف کرتی تھیں اور مرد دن کی روشنی میں مادرزاد طواف کرتے تھے۔

ان روز افزوں انحرافات کے علاوہ بھی بہت سی تحریفیں ان دنوں رونما تھیں، ان ہی حج کے مراسم میں جب کہ تمام لوگ اپنے سارے امتیازات ختم کرنے کے لئے برہنہ طواف کرتے تھے، قریش اور مکہ کے دوسرے ممتاز افراد نے حج کے موقع پر مراسم کی ادائیگی میں اپنے آپ کو عام لوگوں سے ممتاز اور جدا کر رکھا تھا۔ پہلے ایسا ہوتا تھا کہ کچھ لوگ ذی الحجہ کی نویں تاریخ کو صحرائے ''عرفات'' میں قیام کرتے تھے اور عصر کے وقت یعنی غروب آفتاب کے قریب ''منیٰ'' کی طرف کوچ کرتے تھے لوگ شب عرفہ وہاں جاتے تھے اور شب و روز ''عرفہ'' وہیں قیام کرتے تھے۔ جو لوگ شب میں نہیں پہنچ پاتے تھے دن میں آ کر ان لوگوں سے مل جاتے تھے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ غروب آفتاب کے وقت منیٰ کی طرف روانہ ہوتے تھے۔ لیکن قریش کے ممتاز افراد کہتے تھے کہ ہمارا طریقہ عام لوگوں سے الگ ہے۔ ہم پہلے ہی سے وادی ''مشعر الحرام'' کی حدود میں جا کر وہیں اقامت کریں گے اور وہاں سے ''مکہ'' کی طرف واپس روانہ ہو جائیں گے اور وہ بھی ایک خاص وضع اور امتیاز کے ساتھ اور اس کی توجیہ بھی اس طرح کرتے رہے ہوں گے کہ چوں کہ ہم گروہ قریش، خانہ خدا کے ان تمام مہمانوں کے میزبان ہیں لہٰذا ہمارے لئے یہی بہتر ہے کہ ہم عام لوگوں کی نسبت مکہ سے ایک منزل نزدیک رہیں۔ تا کہ حاجیوں کے استقبال کے لئے ان سے پہلے مکہ پہنچ جائیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح کی توجیہات کے ذریعہ تو تقریباً سارے اعمال حج کا قصہ پاک کیا جا سکتا تھا، اسی لئے مناسک حج کے مختلف حصوں میں بہت ساری تحریفیں پیدا ہو گئی تھیں۔

موجودہ حج اور اسلامی امت

آج کل ہمیں حج جیسی اجتماعی عبادت سے جس قدر استفادہ کرنا چاہئے نہیں کرتے۔ آج کے مسلمان حج کے عنوان سے جو اعمال انجام دے رہے ہیں وہ اسلامی تعلیمات سے اسّی فیصد بلکہ اکثر نوے فیصد دور ہے اور اسے فراموش کئے ہوئے ہیں۔

لیکن اسلامی حج کی یہی بچی کھچی حیثیت اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ موجودہ حالات و شرائط کے تحت کسی بھی صورت میں اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کا مقصد یہ بھی نہیں کہ کسی صورت میں آئندہ بھی ایسے حالات نہیں رہیں گے۔ کیوں کہ ممکن ہے وقتی طور پر بعض مخصوص اجتماعی حالات و شرائط کے تحت یا اجتماعی اسباب و علل کے پیش نظر خود مصلحت اسلامی ایک، دو یا تین سال کے لئے حج کو حرام ہی قرار دے دے۔ لیکن اس عبادت کی حیثیت و اہمیت میں کسی طرح کی کمزوری ہرگز نہیں آنی چاہئے۔ ہاں اگر بنیادی طور سے حج کو ہی کمزور بنانے کی کوشش کی گئی تو اس وقت اس سلسلہ میں سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ کیوں کہ جو کچھ میں نے خود سفر حج میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا ہے، نیز اسلامی تاریخ کے مطالعہ کے بعد اس کی حقیقت سے آشنا ہوا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر حج کے مراسم نہ ہوتے تو اب تک جو کچھ باقی ماندہ خوبیاں دنیا کے مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں اسلام کے داخلی و خارجی دشمن انھیں بھی نابود کر چکے ہوتے۔

اسلام میں فرقہ بازی و تفرقہ پردازی خود ملت

اسلامیہ کے لئے ایک بڑی مصیبت رہی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ امت اسلام میں ہر گروہ دین فہمی کے سلسلے میں آزاد ہے، جو کچھ وہ اسلام کے بارے میں سمجھتا ہے، اس پر عمل کرنے میں آزاد ہے۔ ایک شیعہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ شیعہ رہے اور اسلام سے متعلق اپنا نظریہ پیش کرے۔ اس کے سامنے کوئی مجبوری نہیں ہے کہ وہ سنی کی پیروی کرے۔ خود اہل سنت میں بھی کیا کم گروہ بندی ہے؟ چھوٹے چھوٹے گروہوں کو تو جانے دیجئے ان کے بڑے گروہ بھی چار عدد ہیں۔ فقہ میں حنفی ہیں، شافعی ہیں، مالکی ہیں، حنبلی ہیں اور اصول عقائد و اسلام شناسی میں اشعری ہیں، معتزلی ہیں اور۔۔۔۔۔۔شافعی کسی حنفی کو مجبور نہیں کر سکتا کہ تمہیں میرے مسلک پر چلنا ہوگا۔ اسی طرح حنفی بھی شافعی پر کوئی جبر نہیں کر سکتا کہ میری ہی پیروی کرو بلکہ ہر گروہ خود مختار ہے اور یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم اسلام سے متعلق اپنی آزاد فکر رکھتے ہیں اور ہماری منطق جس بات کو قبول کرتی ہے اسی پر عمل کرتے ہیں۔ لیکن جو چیز حرام ہے وہ یہ ہے کہ حنفی، شافعی سے کہے، چوں کہ تم شافعی ہو اور میں حنفی ہوں لہٰذا ہم آپس میں دینی بھائی نہیں ہیں۔ اسی طرح شیعہ و سنی ہیں، کہ شیعہ سنی سے کہے کہ چوں کہ تم سنی ہو لہٰذا ہم میں تم میں کوئی دینی برابری نہیں۔ ایسی بری اور اسلام کش تعبیریں جو ہمارے درمیان رائج ہوگئی ہیں اور اکثر اہل علم حضرات کی زبانوں سے بھی سنی جاتی ہیں خدا معلوم کہاں سے آگئی ہیں۔

ہماری یہ بحث ناصبی یا دشمنان اہلبیتؑ کے سلسلہ میں نہیں ہے۔ وہ ایک الگ موضوع ہے۔ آج کروڑوں افراد پر مشتمل اسلامی سماج میں بہت سی جگہوں پر سرے سے ناصبیوں کا وجود ہی نہیں ہے۔ اور اگر اہل سنت کی آبادی والے ممالک میں بعض جگہوں پر پائے بھی جاتے ہیں تو اہل سنت بھی ان سے نفرت کرتے ہیں۔ یہاں ہم ناصبی اور دشمن اہلبیتؑ سے متعلق بحث ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہماری بحث کا موضوع خالص اور سیدھے سادے اہل سنت ہیں، جن کی اکثریت اہلبیتؑ سے محبت کرتی ہے۔ حقیقتاً بہت سے مقامات پر مجھے ذاتی طور پر کئی اہلسنت دوستوں کو نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جن میں زیادہ تر افراد اہلبیتؑ کے دوستدار ہیں۔ میرا ایک دوست اپنے مصر کے سفر کے حالات مجھ سے بیان کر رہا تھا کہ میں نے مصر میں ایک سنی بھائی سے ملاقات کی، دورانِ گفتگو اس سنی بھائی نے مجھ سے فرمایا:

''آپ سوچتے ہیں کہ اہلبیتؑ کے دوستدار فقط آپ ہی لوگ ہیں؟ ہم بھی اہلبیتؑ کو دوست رکھتے ہیں۔ آپ خود ہی ملاحظہ فرمائیں کہ مصر میں جس قدر علیؑ، حسنؑ وحسینؑ جیسے نام رکھے جاتے ہیں اتنے عثمان، ابوبکر و عمر نام نہیں رکھے جاتے اور اگر آپ لوگ حسنؑ یا حسینؑ کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں تو ہمارے یہاں بھی جو سب سے زیادہ نام رکھا جاتا ہے وہ حسنین ہے۔''

میں خود اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کروں جسے میں اپنے ایک دوست سے ذکر بھی کر چکا ہوں کہ ایک مرتبہ میں ہیمبرگ، جرمنی میں چند ترکوں سے جو حنفی مذہب تھے، گفتگو کر رہا تھا، میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان لوگوں کے دلوں میں اہل بیتؑ کی

محبت کا جذبہ پیدا کروں چنانچہ میں نے اس مقصد کے تحت دو حدیثیں ان کے سامنے نقل کیں۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ان کے چہروں کے تاثرات بدل گئے اور وہ عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے سوچا شاید یہ لوگ اس جذبہ سے بہت دور ہیں اور میں نے ابتداء ہی غلط کی ہے لہٰذا ان کو کچھ فاصلے سے اپنے مقصد کے قریب لانا چاہئے۔ (میں چوں کہ ترکی نہیں جانتا تھا لہٰذا جرمنی زبان میں گفتگو کر رہا تھا اور میرا ترجمان خود ترکی تھا، میری گفتگو کو ترکی میں ترجمہ کرکے ان سے بیان کر رہا تھا) میں نے آزمائش کے طور پر ان سے ایک اور بات کہی کہ دیکھوں یہ لوگ کیا جواب دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ جیسا میں سوچ رہا تھا مسئلہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ان لوگوں نے ترجمان کو جواب دیا کہ ان (ان کی اصطلاح میں خواجہ) سے کہو کیا ہم دوستدار اہلبیتؑ نہیں ہیں جو یہ ہم سے اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں؟ ہم اہلبیتؑ کو دوست رکھتے ہیں۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک شخص مسلمان ہوجائے اور دوستدار اہلبیتؑ نہ ہو؟ لہٰذا ہم ناصبیوں سے متعلق کوئی گفتگو نہیں کر رہے ہیں۔ اصل میں یہ گفتگو سنی مسلمان بھائیوں سے متعلق ہے جن میں کوئی بھی ناصبی نہیں ہے۔

ایک شیعہ کا فریضہ

ایک شیعہ کو کسی صورت میں ایسی باتیں کہنے کا حق نہیں ہے جن سے دینی، سیاسی و اجتماعی سطح پر اہل سنت مسلمان بھائی سے اس کی دینی بھائی چارگی اور اتحاد کی بنیاد متزلزل ہوجائے۔ اگر حج جیسی عظیم عبادت نہ ہوتی تو اب تک مسلمانوں میں انتشار پھیلانے والے بے شمار فتنے سرے سے اسلام ہی کو باد فنا کی نذر کر چکے ہوتے اور میرے خیال سے جن اتحاد بخش رابطوں کو پیغمبرؐ اسلام اور صدر اسلام کے مسلمانوں نے اپنے خون جگر اور اپنی جان و مال کا نذرانہ دے کر قائم کیا تھا، مولا علیؑ نے تیس سال کی خاموش زندگی میں خون دل پی پی کر جس کی حمایت وحفاظت کی تھی، امام حسنؑ مجتبیٰ نے اپنے زمانہ کے تلخ سیاسی شرائط کے ہاتھوں ایک غیر مطلوب دستاویز قبول کرکے جسے محفوظ رکھا اور جنگ روک دی تھی، امام سجادؑ (زین العابدین) سے لے کر امام حسنؑ عسکری تک ہمارے تمام ائمہ طاہرینؑ نے امت کے اسی اتحاد و یک جہتی کے پیش نظر ہر طرح کے مصائب و آلام برداشت کئے تھے۔ اگر مراسم حج نہ ہوتے تو ان بزرگواروں کی یہ تمام جانفشانیاں اب تک نہ جانے کب کی نقش عدم بن چکی ہوتیں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے اتحاد میں رخنہ ڈالنے والوں نے اہل سنت کے ذہن میں یہ بات بھر دی کہ شیعہ اصلاً خدا کو نہیں مانتے شیعہ یہ کہتے ہیں کہ جبرئیل سے غلطی ہوگئی۔ طے یہ تھا کہ وہ علیؑ کے گھر جائے لیکن وہ بھول کر پیغمبرؐ کے گھر چلا گیا اور یہ بھی درست ہے کہ شیعوں کے درمیان یہ بات مشہور کردی گئی ہے کہ جتنے سنی ہیں سب حضرت علیؑ کے دشمن ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثریت علیؑ وائمہ علیہم السلام کا احترام کرتی ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ اس طرح کی غلط تبلیغات نے اپنا پورا پورا اثر دکھایا پھر بھی آخر سال میں ایک بار مختلف ممالک سے کم از کم ایک لاکھ سے زیادہ شیعہ اور سات آٹھ لاکھ سے زیادہ اہل سنت

مکہ میں ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ اگر اک ذرا ہمت و حوصلہ پیدا کر کے ایک دوسرے کے بارے میں غور کریں اور آپس میں مل جل کر ایک دوسرے کے حالات معلوم کریں تو بڑی آسانی سے یہ بات ان کی سمجھ میں آجائے گی کہ یہ سب افواہیں تھیں، جھوٹ اور فریب تھا۔ سوچئے! ابھی حج کی شکل میں کم از کم سال میں ایک ہی بار سہی، اس جھوٹ کو پرکھنے کا موقع تو مسلمانوں کے پاس موجود ہے۔

اگر حج کے اسی ایک فائدہ کو محسوس کیا جائے تو یہی اپنے آپ میں بہت بڑا اور اہم ترین فائدہ ہے۔ لہٰذا میں ذاتی طور پر حج کی اسی امتیازی شان کے تحت اس بات پر بہت زور دیتا ہوں کہ حج کے مراسم ہر سال زیادہ سے زیادہ جمعیت اور شان و شوکت کے ساتھ ادا کئے جانے چاہئے۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ اپنی وصیت میں اپنے بیٹے امام حسنؑ اور اہل خاندان کو اس قدر تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اللہ اللہ، خدا کی یاد میں مشغول رہو، تقویٰ اختیار کرو خوف خدا اپنے دل میں بسائے رہو۔ حج ادا کرو اور اپنے خدا کے گھر اور اس کے اطراف کو خالی و تنہا نہ چھوڑو ورنہ دوسرے اس پر قبضہ جمالیں گے۔

(نہج البلاغہ۔ وصیت بہ حسنین علیہما السلام)

یہ سب اس لئے ہے کہ حج چاہے مقصد کے اعتبار سے جس قدر ضعیف و کم اثر ہوجائے پھر بھی ہمارے لئے ایک عظیم پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا ہے اور ایسی عظیم پناہ گاہ کو کسی بھی حال میں خالی نہیں رکھنا چاہئے۔ اس زمانہ میں موجودہ حج سے جو فائدہ ہم حاصل کرتے ہیں مختلف برسوں اور مختلف شرائط و حالات کے تحت یہ حج ''اسلامی حج'' سے صرف دس سے بیس فی صدی تک ہم آہنگی رکھتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس پُرعظمت عبادت کے اس اسّی سے نوّے فیصدی حصہ کو بھی اختیار کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہئے۔

اللہ کی حقیقی معرفت

حج سے مراد پہلی منزل میں دین کی اہم ترین اصل کی حفاظت کے لئے ایک اہم واقعہ کی یاد تازہ کرنا ہے۔ دین کی اس اہم ترین اصل کا نام توحید ہے۔ اسلام کا نعرہ ہے ''لا الٰہ الا اللہ'' اور پیغمبر اسلام کی رسالت کا نقطہ آغاز ''قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا'' ہے یعنی ''لا الٰہ الا اللہ'' کہو نجات پاجاؤ گے۔ کیا توحید اتنے اہم کردار کی حامل ہے؟ جامع و کامل توحید، انسانی زندگی میں کوئی کمی واقع نہیں ہونے دیتی۔ ہمارے عیب و نقص کا سبب یہ ہے کہ ہم میں صحیح یکتا پرستی کا تصور نہیں ہے۔ اللہ سے متعلق بیشتر لوگوں کی معرفت یا کچھ کم و بیش یا پھر بہت سے مواقع پر ایک دم انحراف کا شکار ہے، جن میں سے بعض انحرافات تو مذکورہ آیت میں بھی بیان کئے گئے ہیں۔ تم کیسے خدا کی عبادت کرتے ہو، یہی مسئلہ ہر اس انسان کے لئے پہلا اور آخری مسئلہ ہے جو خدا کے لئے، اسی کے نام پر اور اسی کی یاد میں زندگی گزارے اس مسئلہ میں سب سے زیادہ دلچسپ اور بے پایاں بات یہ ہے کہ انسان کو برابر، پیہم اور مسلسل اپنے توحیدی عقیدہ کی اصلاح کرتے رہنا چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ مسئلہ اس قدر اہم اور سخت ہے کہ اس سلسلہ میں ایک، دو، چار، دس مرتبہ نہیں بلکہ برابر اور ہمیشہ اصلاح کرتے رہنا لازمی ہے؟ جواب: ہاں یہ مسئلہ اتنا ہی مشکل اور اہم ہے۔ میں مذکورہ آیات سے دو مثالیں پیش کرتا ہوں

تا کہ آپ کو اس کی اہمیت کا احساس ہو جائے۔

ایک یمنی عرب جو بت پرستی چھوڑ کر مسلمان ہوا ہے اور بتوں کی پرستش چھوڑ کر اب صرف اللہ کو یاد کرتا ہے لیکن کیا بات یہیں تمام ہو جاتی ہے اور اس کی توحید کامل ہو جاتی ہے؟ نہیں بلکہ یہ عرب حج کے لئے یمن سے مکہ کی جانب روانگی کا ارادہ کرتا ہے۔ اس طولانی سفر میں زادسفر، سواری اور آذوقہ کا انتظام ایک بدیہی اور لازمی امر ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے، کیا اس سفر میں میں خدا کا مہمان نہیں ہوں؟ چنانچہ جب اس سفر میں خدا کا مہمان ہوں تو مجھے زادراہ اور سواری وغیرہ کے وسیلہ کی کیا ضرورت ہے؟ اور اسی امید پر وہ سفر کے لئے نکل پڑتا ہے اور ظاہر ہے یہیں اس کے عقیدۂ توحید کی خامیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ کوئی اس سے کہے اے یمنی مسلمان بھائی کیا تو اپنے گھر میں خدا کا مہمان نہیں تھا اور فقط اس سفر میں اس کا مہمان ہوا ہے؟ کیا تو صرف حج کے زمانہ میں خدا کے الطاف و اکرام سے فیض یاب اور اس کا مہمان ہوتا ہے؟ یہ پوری زمین تو اسی کا عام دسترخوان ہے۔ آخر تجھ سے کس نے کہہ دیا کہ تو فقط سفر کے ان چار دنوں میں خدا کا مہمان ہے؟ عقیدۂ توحید کی یہ کمی اور خامی جو اس مسلمان بھائی میں پائی جاتی ہے اس کے عمل کو بھی متاثر کرتی ہے۔ یہ فکری انحراف اس کے محور زندگی اور اس کے حرکات و سکنات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ نتیجہ میں وہ اسلامی قانون اور رضائے خدا کے برخلاف اپنے گھر سے بغیر توشہ اور زادسفر کے لئے نکل پڑتا ہے اور ساتھ ہی اسے یہ خیال بھی ہے کہ یہی خدا پر ایمان رکھنے کا تقاضا ہے۔ یہ عجیب خدافہمی اور خداشناسی ہے کہ وہ کہے، زادسفر اپنے ہمراہ نہ لو اگر تم نے ایسا کیا تو گویا خدا پر تمہارا بھروسہ نہیں ہے۔ لیکن وہ خدا جسے اسلام محور و مرکز قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر تم نے توشۂ سفر ساتھ نہ لیا تو خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی کے خلاف عمل انجام دیا۔ اب ذرا اس نظریہ کے تحت ہم اپنی جگہ پر غور کریں کہ ہمارے سامنے کتنے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ امور جو ہم اصلاً واقعاً اور قلباً خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انجام دیتے ہیں ان میں کس قدر انحراف پایا جاتا ہے؟ ہمارے ایسے کتنے اعمال آزمائش اور کسوٹی پر پرکھنے کے قابل ہیں؟ اگر انسان اپنی پوری زندگی یا پھر اپنے اردگرد دوسروں کی زندگیوں یہاں تک علماء و عرفاء کی زندگیوں پر اس زاویہ سے غور کرے تو اسے نظر آئے گا کہ ایک عارف جس نے برسہا برس معرفت خدا میں کمال پیدا کرنے کی کوشش کی، اس کی معرفت میں اضافہ بھی ہوا اور وہ عام اور معمولی سطح سے کہیں بلندتر ہو گیا ہے لیکن کیا مسئلہ یہیں تمام ہو گیا اور معرفت خدا کی حد ختم ہو گئی؟ نہیں، یہ مسئلہ تمام ہونے والا نہیں ہے اور ایسا لامحدود ہے کہ میدان عمل میں بھی اپنا اثر رکھتا ہے۔ آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ''وتزوّدوا'' یعنی زادسفر بھی اپنے ہمراہ لو۔ یہاں قرآن کے بیان کا ہنر اور اس کی بلاغت ہمیشہ کی طرح اپنے کمال پر ہے جہاں وہ ایک عام بات کی طرف اشارہ کرتا ہے وہیں اس کے پہلو بہ پہلو ایک بہترین نتیجہ برآمد کرتا ہے: زادسفر مہیا کرو اور دیکھو آخرت کے سفر میں بھی زادراہ کی ضرورت پیش آئے گی (**فان خیر الزاد التقوی**) تقویٰ آخرت کے سفر کا توشہ ہے۔ بہرحال ہر سفر میں زادسفر کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہاں اعتبارات بدلے ہوئے ہیں۔